



اُردو کے ممتاز مزاح نگار، شاعر اور قلم کار  
مرزا حیدر عباس کو ایک دلہ نشینہ تحریر  
ماموہ اور بھانجھ کا قصہ

دونوں میں ایک قدر ضرور مشترک تھو... خون کو

لہو

کبھی تو کتاب خریدی جاسکتی ہے، لیکن آدمی روز کتابیں خریدے تو زندگی کی اور ضرورتیں پوری کرنے کے لیے پیسے نہ رہیں۔ اب ہر آدمی تو 'اُمرا و جان ادا' والے مرزا رسوا کی طرح نہیں ہو سکتا جو تن خواہ ملتے ہی چھٹرا بھر کتابیں خرید لائے تھے اور جب اُن کی بیوی نے پوچھا، ”ہاے اللہ! مہینا بھر ہم کھائیں گے کیا؟“

تو اُنھوں نے جواب دیا کہ اسی چھٹڑے پر بھنے ہوئے چنوں کی ایک بوری بھی لدوا کر لایا ہوں، چناں چہ ہم نے کتابیں لوگوں سے مانگ تا نگ کر کام چلایا۔ کبھی یوں ہوا کہ کسی بد ذوق کے ہاں بہت اعلیٰ معیار کی کتاب دیکھی تو چپکے سے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لی۔

جب کالج میں آیا تو وہاں کی لائبریری سے وافر تعداد میں کتابیں ملنے لگیں، لیکن کبھی کسی بک اسٹال پر افسانوں کا کوئی بہت اچھا مجموعہ نظر آ جاتا تو جیب خرچ میں سے بڑی کسامی کر کے پیسے اُس پر خرچ کر دیتا۔ اُس وقت میں بڑے یقین سے اپنی بھابی سے کہا کرتا تھا، ”تم دیکھنا بھابی، میں جب نوکر ہو جاؤں گا تو ہر مہینے آدھی تن خواہ میں گزر کیا کروں گا۔ اور

آدھی تن خواہ کی کتابیں خریدا کروں گا۔“

نوکر ہو کر کچھ دن تو واقعی یہی کیا، اس لیے کہ اکیلا تھا اور

پڑھنا میرے لیے ایک ایسے مرض کی حیثیت رکھتا ہے جو لا علاج ہو۔ ویسے کوئی بھی مرض اتنا پرانا ہو جائے جتنی میری پڑھنے کی عادت تو لا علاج ہی ہو جاتا ہے۔ جب میں باقاعدہ طور پر اسکول میں بھی داخل نہیں کرایا گیا تھا، اُس وقت میرے ایک رشتے کے چچا نے بچوں کی لائبریری کھولی تھی۔ میں ناشتا کر کے اُن کی دکان پر جا بیٹھتا اور پھر مجھے اپنا گھر اُسی وقت یاد آتا جب بھوک کے مارے پڑھنا دُوبھر ہو جاتا۔ بچوں کے لیے لکھی ہوئی کہانیوں کے جب سارے سیریز ختم ہو گئے تو بڑی پریشانی ہوئی۔

کچھ دیر گھر میں پڑی ہوئی کتابیں کھنگالیں۔ پھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ بازار میں ایک بوڑھے میاں نے چھوٹی سی لائبریری کھول لی، مگر اُس میں 'ٹارزن کی واپسی' اور 'طلسمی قلعہ' وغیرہ قسم کی کتابیں نہ تھیں، چناں چہ مجبوراً بڑوں کے ناول پڑھنے پڑے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بھوک میں کواڑ پا پڑ ہو جاتے ہیں۔ وہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ چھٹی کلاس میں 'فردوسِ بریں' اور 'توبۃ النصوح' ہضم کر لیے۔ اُس وقت سے اب تک پڑھنے کا مرض جان سے چمٹا ہوا ہے۔

پڑھنے والوں کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ پڑھنے کے لیے اتنی بہت سی کتابیں حاصل کہاں سے کی جائیں۔ کبھی

سب رنگ



تن خواہ کافی تھی، لیکن وہ ہاں کرنے کے بعد جس کے عوض ہر شریف آدمی عمر بھر کے لیے اپنی آزادی بیچ دیتا ہے، کبھی آدمی تن خواہ کی کتابیں خریدنے کی توفیق نہ ہوئی، بل کہ ہرنچے کی پیدائش کے ساتھ کتابوں پر خرچ ہونے والی رقم کا تناسب گھٹتا گیا، اور اب چار پچوں کے ساتھ جو ماشاء اللہ اسکول میں پڑھتے ہیں اور بیوی کے ساتھ جو بڑی باقاعدگی سے بیمار رہتی ہے، یہ تناسب صفر سے کچھ ہی اوپر رہ گیا ہے۔

ایسے عالم میں میری بھانجی کا خط آیا تو مجھے یوں لگا جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا ہو۔ اُس نے لکھا تھا، ”اُلو کی کتابیں اب میرے گھر میں پڑی ہیں۔ آپ کبھی سکھر آئیں تو ان میں سے جتنی بھی کتابیں آپ کو پسند ہوں، وہ لے جائیں۔“ اُس لڑکی کے اُلو بے چارے بڑے اچھے آدمی تھے۔ بہت قناعت پسند اور گوشہ گیر قسم کے۔ زندگی میں اُن کی ایک ہی تفریح تھی، ایک ہی مشغلہ تھا اور وہ تھا کتابیں پڑھنا۔ اوائل جوانی میں سائنس اُن کا دل پسند مضمون تھا۔ پھر سائنس سے ادب کی طرف آئے۔ چند افسانے بھی لکھے۔ ادب سے جی اکتایا تو فلسفے کی وادی میں نکل گئے۔ آخری عمر میں طبیعت نے پلٹا کھایا تو مذہب اور تاریخ اسلام کے رسیا ہو گئے۔ ریلوے میں بابو تھے، اور عیال دار بھی۔ اس لیے بہت پیسا تو کتابوں پر خرچ نہ کر سکتے تھے، لیکن پھر بھی مختلف موضوعات پر اُنھوں نے اچھی خاصی کتابیں جمع کر لی تھیں۔

سائنس کو تو میں بچپن ہی سے سات سلام کرتا تھا، لیکن اس کے علاوہ اُن کی پسند کے جو مضامین تھے، وہ سب مجھے بھی دل چسپ لگتے تھے، اس لیے اُن کی لائبریری میں سے جن کر کتابیں لانے کا یہ موقع مجھے ایسا ہی لگا جیسے ہفت اقلیم کے بادشاہ نے پیغام بھجو دیا ہو کہ میرے خزانے میں سے جتنے جواہرات چاہو، لے جاؤ، چناں چہ میں نے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر سکھر جانے کا پروگرام بنالیا، جہاں بہ ترین کتابوں کا ایک ذخیرہ میرا منتظر تھا۔

میرا خیال تھا کہ کتابیں بڑی قیمتی چیز ہوتی ہیں، حالاں کہ بھانجی تو مجھے یہ لکھ چکی ہے کہ آپ جتنی کتابیں چاہیں، آ کر لے جائیں، لیکن اُس کا شوہر شاید اس بات کو پسند نہ کرے۔ اس لیے جب میں سکھر میں اپنی بھانجی کے ہاں پہنچا تو اُس کے

شوہر سے بہت ہی معذرت خواہانہ لہجے میں کہا، ”اس بے چاری نے لکھا تھا کہ اُلو کی کتابیں ہمارے پاس پڑی ہیں۔ ان میں سے کچھ آپ کو چاہیں تو لے لیں۔“

دراصل اس جملے سے میں اُس کا ردِ عمل معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ میرے کتابوں کے اس طرح لے جانے پر کہیں برا نہ مانے اور کہیں یہ نہ ہو کہ وہ میرا سوٹ کیس کتابوں سے بھرا دیکھ کر کہے کہ جناب ہم نے تو تکلفاً کہا تھا، آپ تو ساری کتابیں لے اُڑے، لیکن جو ہوا وہ میری توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ اُس نے کہا، ”ہاں ماموں، کتابیں و کتابیں آپ سب لے جائیے گا، مگر اس وقت تو شطرنج کھیلیں۔“

تین چار دن ہنسی خوشی بسر ہو گئے۔ دن میں جب بھانجی کے بچے اسکول چلے جاتے اور میاں دفتر، تو میں کتابیں چھانٹنے میں لگ جاتا اور شام کو اُن بچوں کے ساتھ، جو میرے نواسے لگتے تھے، شہر گھومتا اور رات کو اپنی بھانجی کے شوہر کے ساتھ شطرنج کھیلتا۔

جس دن سہ پہر میری روانگی کا پروگرام تھا، اُس دن صبح میں بڑا پریشان تھا۔ کوئی تین چار سو کتابیں اُس کمرے میں موجود تھیں۔ سائنسی موضوعات اور معاشیات و سیاسیات کی کتابیں چھوڑ کر اور وہ کتابیں بھی نظر انداز کرنے کے بعد، جو میری پسند کے موضوعات پر تو تھیں، لیکن معمولی مصنفین کی لکھی ہوئی تھیں۔ کوئی ڈیڑھ سو کتابیں ایسی تھیں جو میں لے جانا چاہتا تھا۔ اس بات کا بھی خیال تھا کہ بھانجی کا شوہر مجھے بالکل ہی گھٹیا آدمی نہ سمجھ لے، چناں چہ بار بار کتابیں ادھر سے ادھر رکھتا تھا۔ پشکن، گورکی، فلاہیر، موپاساں، ترگنیف، ٹالسٹای، مام، اوہنری، ڈکنس... یا اللہ، کسے رکھوں، کسے چھوڑوں۔ اُن کتابوں کے علاوہ، جو عالمی ادب میں کلاسیک کا درجہ رکھتی تھیں، بیسیوں کتابیں مہم جوئی، تحیر اور تجسس سے بھرپور تھیں۔ ’الفریڈ چپاک میگزین‘، پیٹر شینی، کارل ولرچ، اگا تھا کر سٹی اور گارڈنر کے ناول، سینٹ کی پوری سیریز۔ ان میں دل چسپی رکھنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا ترجمہ ڈائجسٹوں میں چلایا جاسکتا تھا اور ان سے کافی مال کمایا جاسکتا تھا۔ پڑھنے کی عیاشی اس کے علاوہ تھی۔ پھر اردو میں بھی سرمایہ کم نہ تھا، پریم چند، عصمت، منٹو، بیدی، کرشن چندر، شفیق الرحمان۔ ادب سے دل بھر جائے تو خالص ذہنی غذا کے طور پر فلسفے، مذہب اور تاریخ اسلام کی ضخیم اور بڑے مغز کتابیں:

سب رنگ





مرزا حیدر عباس: شاعر، ادیب، کہانی کار، مزاح نگار، معلم، مترجم، محقق۔ 1942ء  
بھرت پور، ہندوستان کے ایک علمی و ادبی خانوادے میں پیدائش۔ انگریزی اور اردو میں  
ایم اے۔ 32 سال شعبہ تعلیم سے وابستگی۔ کئی کتابوں کے مصنف۔ شاعری کا مجموعہ:  
'پیار کے گیت'۔ افسانوں کے مجموعے: 'خوابوں کی گلیاں' اور 'دھوکے بازوں کا شہر'۔  
امام زین العابدین کی سیرت و سوانح پر کتاب 'چشم و چراغ کربلا'۔ دو سال تک  
ریڈیو پاکستان سے نشریے: 'آواز دوست' اور 'صبح بہار'۔ ممتاز روزناموں میں تواتر سے طبع زاد، فارسی  
اور انگریزی سے ترجمہ کیے ہوئے مضامین کی اشاعت۔ ٹیلی وژن سے مقبول ڈرامے 'جھروکا'،  
'خوش نصیبی کا دروازہ' اور 'احسان'۔ 23 جنوری 1999ء کو کراچی میں انتقال۔

ایک خوش گوار صبح، جب میں دفتر جانے کی تیاری  
کر رہا تھا، دروازے پر کھٹکا ہوا۔ میں نے دروازہ کھولا تو ساجد  
کھڑا تھا۔ یہ میری بھانجی کا بڑا بیٹا تھا۔ میں نے حیرت سے کہا،  
”ارے تم کیسے؟ کس کے ساتھ آئے۔“  
اُس نے بتایا، ”اُتو کے آفس کی وین کراچی آرہی تھی، اُس  
میں میں بھی آ گیا اور چھوٹا بھائی بھی۔“  
میں نے کہا، ”لہجھا، اندر آؤ۔“

وہ ہنس کر بولا، ”یہ بوری تو اُتر والیجیے وین سے۔“  
بوری بہت بھاری تھی۔ اُس میں اٹا اٹ کتابیں بھری ہوئی  
تھیں۔ شکرگزاری کے جذبے سے میری آنکھوں میں آنسو  
آگئے۔ یہ کتابیں اگر بازار سے خریدی جاتیں تو ان کی قیمت  
کئی ہزار بنتی۔ اتنی کتابیں نہ صرف بغیر کسی قیمت کے مل گئی  
تھیں، بل کہ گھر بھی پہنچادی گئی تھیں۔

بوری اُتروا کر میں نے کمرے میں رکھوائی۔ پھر یوں ہی  
بات چیت کی خاطر ساجد سے پوچھا، ”اور بھئی، امی نے کچھ  
کہلوا یا بھی ہے؟“

وہ بولا، ”جی ہاں۔ امی نے تاکید کی ہے کہ خالی بوری  
واپس لے آنا، بھولنا مت۔“

میں نے حیرت سے کہا، ”بوری واپس کر دوں؟ اس کی  
تاکید ہے؟ بھئی اس بوری میں کیا خاص بات ہے؟“

ساجد نے ہنس کر کہا، ”لیجیے، آپ کو یہ بات بھی معلوم نہیں کہ  
بوریاں کتنی منہنگی ہوگئی ہیں۔ دس، بارہ روپے کی آتی ہے خالی  
بوری۔ اسی لیے تو امی نے کہا، بوری ضرور واپس کر دیں، کام  
آجائے گی کبھی نہ کبھی۔“



کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست  
بہت دل پر تھڑکھا اور کتابیں دل سے اُتارنے کی کوشش کی،  
لیکن پسندیدہ کتابوں کی تعداد سو سے کم نہ ہوئی تھی۔ ایک ساتھ  
اتنی کتابیں لانے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ اس کی دو جہیں تھیں۔ پہلی  
تو وہی کہ بھانجی کا شوہر کیا سوچے گا اور دوسری یہ کہ سفر میں سامان  
زیادہ رکھنا میری طبیعت کے خلاف تھا عجیب کش مکش کی کیفیت  
تھی۔ آخر میں نے فیصلہ اپنی بھانجی ہی پر چھوڑ دیا۔ میں نے اُس  
سے کہا، ”سنو مٹی! میرے سوٹ کیس میں کپڑوں کے علاوہ جو جگہ  
ہے، اُس میں تو صرف پندرہ سولہ کتابیں آتی ہیں۔ یہ میں لے  
جارہا ہوں۔ باقی کتابوں کا یہ ہے کہ میں نے اپنی دل چسپی کی  
کتابیں الماری سے نکال کر ریک میں بھر دی ہیں۔ یہ کوئی ڈیڑھ سو  
کتابیں ہیں اور ان میں سے کوئی بھی کتاب چھوڑنے پر میرا دل  
راضی نہیں ہو رہا اور چوں کہ میں بہت کاہل آدمی ہوں، اس لیے  
اتنی کتابیں لے جانے کا جھمیلنا بھی نہیں کر سکتا۔ اب یہی صورت رہ  
جاتی ہے کہ تم کبھی کراچی آؤ تو لیتی آنا۔“  
وہ ہنس پڑی۔

چلتے وقت اُس نے کہا، ”اچھے ماموں! یہ کتابیں یا تو میں  
خود لیتی آؤں گی، یا کراچی آنے کا پروگرام نہ بنا تو ان کے آفس  
کی وین کراچی جاتی ہے، اُس سے آپ کے گھر بھجوادوں گی۔“  
میں کراچی آ گیا۔

وہ پندرہ سولہ کتابیں، جو میں ساتھ لایا تھا، مہینے بھر میں ختم  
ہو گئیں۔ میں اب پچھتانے لگا کہ کیوں اتنا پیارا ذخیرہ چھوڑ آیا۔  
اس بات کا یقین ہی نہیں آتا تھا کہ بھانجی اتنی ڈھیر ساری کتابیں  
میرے گھر بھجوانے کی تکلیف بھی گوارا کرے گی جب کہ اُن  
کتابوں سے عشق کے باوجود میں خود یہ تکلیف گوارا نہ کر سکا۔